1

فروری 2016ء / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۷ھ

خدا پرستی، انسان دوستی، معاشی انصاف



10 روپے

بیاد: حضرت مولانا ثناء اللہ قاری رحمۃ اللہ علیہ

بدعا: حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم

مجلس ادارت

محمد عرفان شجاع | مولانا محمد عابد

ملنے کے پتے

صفہ ٹرسٹ
موہنی روڈ لاہور

دار القرآن والترتیل
14۔ لٹن روڈ مزنگ لاہور

مکتبہ قاسمیہ
الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

دار العلوم حسینیہ
صوفیہ آباد لاہور

مکتبہ الحسن
اردو بازار لاہور

قاری خالد محمود
کیپٹن جمال روڈ سانده کلاں

اقرأ کمپنی
غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور

دار الکتاب
غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور

رابطے کے لیے

0333-4432853, 0331-0070580
email:safhat2016@gmail.com
facebook.com/safhat2016

خط و کتابت کے لیے: 3۔محمود سٹریٹ، موہنی روڈ لاہور۔

سطریں

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ اَمَّا بَعْدُ !

بعد الحمد والصلوٰۃ...... ہمارے ہاں روزنامہ، ہفت روزہ، ماہنامہ، دوماہی، سہ ماہی، سیاسی، اَدبی، علمی و فلمی اَخبار، سائل اور جرائد پہلے ہی وافر مقدار میں موجود ہیں اِس نقار خانے میں ایک اور طوطی کا اِضافہ کیوں؟ بقول فیض صاحب: اَوّل تو ایسے سوالات کا قطعی کوئی جواب نہیں ہوتا اور اگر کوئی جواب ہے تو وہ قارئین کے ذمہ ہے۔

قرآنِ حکیم جو اِنقلابی تحریک پیدا کرنا چاہتا ہے اُس کا ایک نصب العین اور مرکزی فکر ہے وہ ہے ایسی دعوت جس کے نتیجہ میں خدا پرستی قائم ہو اور اُس کے دو راستے ہیں: اِنسان دوستی اور معاشی انصاف۔ دینِ اِسلام کا ایک بہت بڑا شعبہ اَخلاقیات کا نظام ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ اِجتماعی معاشیات کا اِجتماعی اَخلاق پر نہایت گہرا اَثر پڑتا ہے اِس لیے اِجتماعی اَخلاق کے لیے ضروری ہے کہ اِنسانی سماج میں عادلانہ نظامِ معاشیات قائم کیا جائے اور جب تک اِس قسم کا نظام سماج میں قائم نہ ہو جائے اِجتماعی اَخلاق کا حسن نمایاں نہیں ہوسکتا۔ روزمرہ کی سیاسی، مذہبی، معاشی، معاشرتی، قومی اور بین الاقوامی صورتحال نے کچھ سوالات پیدا کیے ہیں، آپ اور ہم اُن کے دیے گئے جوابات سے اِختلاف یا اِتفاق تو کر سکتے ہیں مگر اُن سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ یہی ہمارے ''صفحات'' کا موضوع ہوگا اور ہمارے اَوّلین مخاطب وہ لوگ ہیں جو خدا پرستی کی تحریک میں کسی بھی پلیٹ فارم پر جہد میں ہیں اور اِصلاح کے لیے کسی بھی اِجتماعیت کا حصہ ہیں، ہمیں اُن کی توجہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲ کی جانب مبذول کرانی چاہیے جہاں خدا کی تنبیہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ (زمین پر فساد نہ پھیلاؤ) کے جواب میں اہلِ فساد دعویٰ کرتے ہیں کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (ہم تو اِصلاح کرنے والے ہیں)۔ دینی دعوت کے لیے قرآنی اُسلوب سے رہنمائی لی جائے گی جو اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دو اور [اگر بحث کی نوبت آئے تو] ان سے بحث بھی ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو: النحل ۱۲۵) کی شکل میں ہمارے لیے موجود ہے۔ اِس جہد کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کے الفاظ میں ''حجرہ نشین زاہد، کتاب کے کیڑے طالب علم، مدرسوں میں درس دینے والے برق تقریر عالم، دُکانوں میں بیٹھنے والے تاجر، اَسباب ڈھونڈنے والے مزدور'' سب کو ایک صف میں آنا ہونا ہوگا۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ ''قومیں جب عمل سے عاری ہو جاتی ہے تو حسن عمل کی بجائے چند عقائد کو ذریعہ نجات بنا لیتی ہیں...... دِل تاریک اور ہاتھ بیکار ہو جاتے ہیں۔ ''صفحات'' ایک فکری تسلسل کی تفہیم کے ساتھ ساتھ اُس کے عملی پہلوؤں پر بھی مکالمہ کرے گا۔ ہمارے ذرائع اور صلاحیتیں محدود ہیں اور یہ اَوّلین کوشش .... ہم خود کو ایک عام قاری سے بہتر نہیں سمجھتے اِس لیے اِس سلسلہ کا عنوان صرف ''صفحات'' تجویز کیا ہے کسی بھی اور نام میں ایک دعویٰ شامل ہوتا جس کے لیے ہم تیار نہیں۔ اِبتدائی تجربات میں خامیوں اور کوتاہیوں کا ہونا فطری ہے، اُن کی اِصلاح کے لیے توقف سے بہتر ہے کہ ہم احباب کے مشوروں پر بھروسہ کریں اور مندرجات کے معیار کو حسبِ توفیق بہتر کر سکیں، جگرؔ فرما گئے ہیں:

اللہ اگر توفیق نہ دے اِنسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

محمد عرفان شجاع
20 فروری 2016ء

حضرت مولانا قاری ثناء اللہ نور اللہ مرقدہ کی رحلت

محمد ادریس اپل

موت کی یاد اک دانائی، موت کو بھولنا بے وقوفی ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت اور امتحان گاہ کا اختتام، موت زندوں کے لیے ایک عبرت اور زندگی اک یاد اور حسرت، موت دوسرے جہاں کے دروازے کی دہلیز، موت دنیاوی زندگی کا آخری کنارہ، زندگی ایک مہلت اور موت اس کا خاتمہ، موت کا وقت معین، موت ہر کسی کے لیے، موت جسم سے روح کے رشتے کے انقطاع کا نام۔ موت تمیز بندہ وآقا سے امتیازات سے ماوراء، موت سے بچنے کی تدبیریں، کوششیں اور حسرتیں ہزار، لیکن موت کا فیصلہ اٹل۔ صدی، سال، مہینے، گھنٹے، منٹ سیکنڈ لمحے اور سانس گنے ہوئے، نہ آگے نہ پیچھے۔

صبح گیارہ بج رہے تھے، وارث روڈ متصل جیل روڈ اے ایچ موٹرز جا رہا تھا، جہاں میں آج کل مستقل وقت دے رہا ہوں یہ بیٹے معاذ اسجد کا گاڑیوں کا شوروم ہے کہ حافظ ابوبکر شیخ کا فون آیا کہ آپ کہاں ہیں؟ شوروم پر ہیں؟ میں نے سوچا شاید ملنے آئے ہیں۔ کہا: راستے میں ہوں، دس منٹ میں پہنچنے والا ہوں۔ انہوں نے غمناک خبر سنائی کہ ابھی قاری ثناء اللہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ بس اس کے بعد فرط غم سے انہیں کچھ کہنے کی ہمت ہوئی، نہ مجھ میں سننے کی تاب۔ دونوں طرف غمناک خاموشی اور سکوت کے بعد فون بند ہو گئے۔ دن بھر کبھی ان کے والد قاری عطاء اللہؒ سے رشتہ احترام اور باہمی قدر و منزلت کے قصے یاد آتے رہے اور کبھی قاری ثناء اللہ کے آغاز جوانی میں جمعیۃ طلباء اسلام کے پلیٹ فارم سے سعی و کوشش اور پھر لاہور کی امارت کیلئے ان سے مختلف رائے۔ لیکن ایک بات نے عجیب الجھن سی پیدا کر دی کہ کسی اور طرف سے چار بجے تک کوئی اطلاع نہ آئی، شاید میرے سننے میں کچھ غلطی ہو گئی۔ تو جناب چوہدری امتیاز قمر کے میسج نے تصدیق کر دی اور جناب شاید اسرار کے میسج سے جنازے کا وقت معلوم ہو گیا کہ رات 8:30 بجے جنازہ گاہ لٹن روڈ پر نماز جنازہ ہو گی۔ ان کی رہائش گاہ و مدرسہ میں آٹھ بجے پہنچا تو موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کی قطاریں اور مدرسے کے اندر و باہر ہجوم دیکھا تو آگے بڑھا۔ دیرینہ ساتھی قاری غلام حسین ملے انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگے: ادھر کھڑے ہو جاتے ہیں، بدنظمی بہت ہے، بڑی دھکے پڑ رہے ہیں، کچھ ہجوم چھٹتا ہے تو پھر چلتے ہیں۔ لیکن لوگ تو جہاں جم گئے انہوں نے میت کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ مجال ہے کہ کوئی آسانی سے آگے بڑھ سکے۔ ایک بزرگ صورت تلقین کر رہے تھے کہ چہرہ دیکھنا مستحب ہے اور دھکے دینا حرام ہے، لیکن کون سنتا ہے۔ ہم ہمت کر کے آگے بڑھے تو جسد خاکی تک پہنچ گئے، مرحوم کا آخری دیدار کیا۔ واہ! ثناء اللہ اتنا نورانی چہرہ تو تیراز زندگی میں نہ تھا جتنا موت کی چادر اوڑھ کر روشن لگ رہا تھا۔ قاری غلام حسین نے میرا ہاتھ نہ چھوڑا اور ہم دھکم پیل کے اس ماحول سے باہر آ گئے اور جنازہ گاہ پہنچ گئے۔ وسیع جنازہ گاہ بھر گئی، صفیں قریب قریب کروائی گئیں، پھر بھی جگہ پوری نہ ہوئی۔ سیڑھیوں کے دروازے کھولے گئے، لوگ چھتوں پر چلے گئے، صحن بھی کھچا کھچ بھرا تھا۔ ملحقہ مسجد بھری تھی لوگ سڑک پر آ گئے۔ نماز جنازہ استاذ الحدیث جامعہ مدنیہ مولانا نعیم الدین دامت برکاتہم نے پڑھائی۔ واپس ہونے لگا تو شیخ عثمان برادر اصغر حافظ ابوبکر شیخ نے میرا ہاتھ پکڑا۔ بدلے بدلے عثمان کو پہچاننے میں چند سیکنڈ لگے کہ وقت کے ساتھ ساتھ جہاں لباس اور حلیے بدل جاتے ہیں وہاں چہروں اور نقوش پر بھی گزرا ہوا وقت اپنے نشان اور لکیریں ثبت کر دیتا ہے۔ عثمان نے بھی میرا ہاتھ اور ساتھ نہ چھوڑا اور کہا: ہجوم چھٹ لینے دیں تب آگے بڑھیں گے۔

مولانا قاری ثناء اللہ نے بچپن میں قرآن کریم حفظ کیا اور درس نظامی مکمل کی۔ جمعیۃ طلباء اسلام میں کام کرتے رہے متحرک اور نمایاں کردار ادا کیا۔ کچھ عرصہ سعودیہ میں رہے وہاں ان کی صلاحیتیں نکھریں عربی زبان بولنے پر مہارت حاصل ہوئی، ان کا لہجہ اور انداز سدھرا۔ قرأت میں خوش الحانی آئی انداز تقریر جاندار اور موثر ہوا۔ والد کی وفات کے بعد مدرسہ کا انتظام سنبھالا، اسے ایسی ترقی دی کہ حق ادا کر دیا۔ کئی شعبے قائم کیے، خود مصر و حجاز اور لبنان کی چھپی ہوئی عربی کتب منگواتے اور دوستوں کو فروخت کرتے اور رقم قسطیں طے کر کے وصول کرتے۔ پانچ سال جمعیۃ علماء اسلام ضلع لاہور کے امیر رہے آئندہ کیلئے بھی امیدوار تھے مگر کامیاب نہ ہوئے۔ پھر جمعیۃ علماء اسلام پنجاب کے نائب امیر بنائے گئے۔ ان کا خطاب منفرد ہوتا، قرآن و حدیث سے عربی عبارات کیساتھ استدلال کرتے۔ قرآن اچھا پڑھتے، عوامی رابطے میں رہتے۔ ان سے توقعات ان کی موت نے ختم کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو قبول فرمائے اور ان کی سیئات اور خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔ آمین۔

حالات حاضرہ

دنیا میں یک محوریت کا خاتمہ

حافظ محمد ابوبکر شیخ ڈپٹی ایڈیٹر ماہنامہ الجمعیۃ راولپنڈی

13 نومبر 2015ء کو فرانس کے دارالحکومت پیرس کے سٹیڈیم میں فٹ بال میچ کے دوران خودکش حملہ اور زبردست فائرنگ کا واقعہ پیش آیا۔ سٹیڈیم میں فرانس کے صدر بھی میچ دیکھ رہے تھے۔ اس مرکزی مقام کے قریب پیزا سینٹر، جاپانی ہوٹل اور کمبوڈین مطبخ میں بھی دھماکے ہوئے، ان دھماکوں اور فائرنگ سے 130 افراد ہلاک اور تقریباً 400 زخمی ہوئے۔ فرانس کی سرزمین پر دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ سب سے بڑا واقعہ ہے جس کو حکومت نے جنگی اقدام قرار دیا اور بتایا کہ اس کی منصوبہ بندی ملک سے باہر کی گئی۔ ان حملوں کی ذمہ داری گزشتہ دو سال میں قائم ہونے والی عراقی شامی مسلح تنظیم (آئی ایس آئی ایس) ''داعش'' نے قبول کی اور کہا کہ یہ شام میں فرانسیسی مداخلت کا جواب ہے۔ داعش نے دیگر صلیبی ممالک پر مزید حملوں کی دھمکی بھی دی اور مسلمانوں کو اکسایا کہ وہ فرانس میں حملے کریں۔ ویڈیو پیغام میں کہا گیا ہے کہ جو شام نہیں پہنچ سکتے وہ فرانس میں کاروائیاں کریں۔ شامی صدر بشار الاسد نے پیرس حملوں پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ فرانس ان حملوں کا خود ذمہ دار ہے، پیرس کو اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ امریکی صدر بارک اوباما ترکی کے دورے پر تھے ان کا مذمتی بیان اس پیش کش کے ساتھ سامنے آیا کہ امریکہ ان حملوں کے ذمہ داروں تک پہنچنے کے لئے فرانس حکومت سے ہر ممکن تعاون کرے گا۔ اوبامہ نے کہا کہ داعش ایک ایسی قوت بن چکی ہے جس نے انقرہ (ترکی) سے پیرس (فرانس) تک لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پیرس پر حملوں سے پہلے شام پر امریکہ، برطانیہ اور ان کے اتحادی ممالک کی پالیسیوں اور اقدامات کے دوران روسی رویہ خاصا مختلف رہا ہے۔ روس داعش کے خلاف بہت واضح موقف رکھتا ہے، مگر بشار الاسد کے خلاف نہیں ہے۔ روس کے نزدیک داعش خود امریکی اتحادیوں نیٹو وغیرہ کی تیار کردہ ہے اور انہی کے لئے خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ روس کے تعلقات نیٹو اتحاد کے اہم رکن ترکی سے خاصے خراب ہو چکے ہیں، اور اس نے ترکی پر ایک ہفتے کی قلیل مدت میں بہت سی اقتصادی پابندیاں لگائی ہیں، عسکری تعاون بھی ختم کر دیا ہے اور اپنے سیاحوں کو یہ کہہ کر ترکی جانے سے روک دیا ہے کہ وہاں دہشت گردی کا خطرہ ہے۔ یاد رہے کہ روس اور ترکی کے اقتصادی تعلقات غیر معمولی حجم کے حامل رہے ہیں، لیکن روس ترکی کو داعش کا غیر اعلانیہ اتحادی قرار دیتا ہے۔ شام کے قضیے اور پیرس حملوں کے بعد عالمی طاقتوں کے پالیسی بیانات میں بہت سی مماثلتوں کے باوجود بیشمار تضادات پائے جاتے ہیں۔ مخصوص جغرافیائی خطے کے اندر ترک کردار غیر معمولی شکل میں واضح ہو رہا ہے۔ ترکی ایک طرف امریکہ کا گرم جوش اتحادی ہے، چنانچہ امریکی صدر انقرہ آتے ہیں تو مراعات کا اعلان کرتے ہیں۔ جبکہ چند ماہ قبل یہ خبریں گردش میں تھیں کہ داعش میں شمولیت کے خواہشمند ترک بارڈر کا راستہ استعمال کر رہے ہیں۔ آج کل یہ مشہور ہے کہ داعش کے زیر قبضہ علاقوں کا تیل ترک راستوں سے فروخت ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت بھی بیان کی جاتی ہے کہ داعش کے زخمیوں کا علاج معالجہ ترکی میں ہوتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ داعش پر بمباری میں امریکہ، روس ایک ہیں تو ترکی روسی جہاز کو کیوں مار گراتا ہے؟ ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاملہ سادہ اور آسان ہے مگر اس کو جان بوجھ کر پیچیدہ بنایا جا رہا ہے۔ معاملہ سادہ کیسے ہے؟ آیئے، اس سوال پر غور کریں۔ دو اڑھائی سال کی مختصر مدت میں ایک عسکری تنظیم کا قائم ہو جانا جس میں پچاس ہزار سے زائد جنگجو اور پانچ ہزار باقاعدہ تربیت یافتہ بھی ہوں، (مثال کے لئے دیکھیں افغانستان میں امریکہ کتنے عرصے سے مقامی فوج تیار کر رہا ہے) اس تربیت یافتہ گروہ کی فتوحات کا ایک بڑا سلسلہ چل نکلنا، ان کے مفتوحہ علاقوں میں قدرتی تیل کا ہونا پھر مزید یہ کہ انتہائی بدامنی، جنگی صورتحال کے باوجود تیل کا نکلتے رہنا اور عام مارکیٹ میں پہنچ کر سستے داموں فروخت ہونا، امریکہ کا اپنے ملک کے اندر موجود تیل کے اثاثوں کو منجمد کر دینا اور ترکی کیساتھ اپنے تعلقات کو غیر معمولی ڈگر پر ڈالنا، ساتھ ہی ساتھ تمام تر امور سرانجام دینے والی تنظیم داعش کا دنیا کی امیر ترین دہشت گرد تنظیم ظاہر ہونا ثابت کرتا ہے کہ داعش، ترکی اور امریکہ تکونی اتحاد نہیں بھی ہے تو ان میں تعلقات کار بہرحال موجود ہے۔ ایسے میں روسی جہاز کی ترکی کے ہاتھوں تباہی کا معاملہ بھی پیچیدہ نہیں رہتا۔ داعش، جنگجوؤں سے زیادہ اگر اقتصادی ایجنڈے کا عنوان ہے جیسا کہ ثابت ہوتا ہے، اور اس سے ترکی کی وساطت سے امریکہ کا مفاد وابستہ ہے تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ شام، داعش، ترکی کے عنوان سے تیسری عالمی جنگ نہیں مگر دوسری سرد جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس جنگ کے مرکزی کردار وہی ہیں جو پہلی سرد جنگ کے تھے یعنی امریکہ اور روس۔ سویت یونین کے انہدام کے بعد روس کی قوت کمزور ہو چکی تھی، امریکہ کا سیاسی شکنجہ عالم گیر سطح پر گرفت کر چکا تھا، ربع صدی بعد حالات بدل رہے ہیں، روس بڑے مرحلے سے نکل چکا ہے، 1917ء کے بالشوک انقلاب کے بعد سے روس کا جو امریکہ مخالف عالمی کردار تھا ربع صدی دبا رہنے کے بعد پھر اجاگر ہو رہا ہے۔

امید پیدا ہو رہی ہے کہ دنیا یک محوری گردش سے نکل سکے گی۔ اس بار روس کو یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ امریکہ مذہب اسلام کو بطور ہتھیار اس کے خلاف استعمال نہیں کر پائے گا، کیونکہ افغانستان، عراق اور لیبیا کو تباہ کرنے، وہاں کی کثیر آبادی کا قتل عام کرنے، ان ممالک کے اثاثے لوٹنے، مساجد و امام بارگاہوں اور مزارات مقدسہ پر بمباری کرنے کے بعد امریکہ، برطانیہ اور ان کے اتحادیوں کی مذہب دوستی کا لبادہ چاک ہو چکا ہے، مسلم دنیا کے عوام بہت چوکنا ہو چکے ہیں۔ اب یہ ممکن بھی نہیں لگتا کہ پہلی سرد جنگ کی طرح یورپی حکمران امریکی پلڑے میں اپنا پورا وزن ڈال دیں۔ تاہم اس حوالے سے یورپ کے دو اہم ممالک فرانس اور جرمنی کا کردار بہت کلیدی نوعیت کا بن گیا ہے، ان کے لئے موقع ہے کہ وہ امریکی سیاسی تسلط سے نکل آئیں اور اپنے فطری، جغرافیائی اتحادی روس سے اقتصادی مراسم مستحکم کرتے ہوئے طاقت کے عالمی توازن کو ایک ستون سے چار پانچ ستونوں میں تقسیم کر لیں۔ خود یورپی عوام کی یہ رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے جو 13 نومبر کو پیرس حملوں کے بعد ہلکی آواز میں سامنے آئی ہے کہ: ''امریکہ طویل فاصلے پر بیٹھ کر ان کے قریبی جغرافیائی خطوں میں شورش برپا کرتا ہے، وہاں مسلح عسکریت پسند تنظیموں کو سہولیات و ماحول فراہم کرتا ہے پھر ان سے خوف دلا کر ترقی یافتہ ممالک کو ساتھ ملا لیتا ہے۔'' 13 نومبر کے پیرس حملوں کے بعد یورپی عوام نے امریکہ کے اس نعرے کو مسترد کر دیا کہ ''دنیا بھر کے مسلمان دہشت گرد ہیں'' اہل یورپ نے نائن الیون کے بعد امریکی طرز عمل کو اختیار نہیں کیا، یہ اس سوچ کو تقویت دیتا ہے کہ دہشت گردی کا ''ہوا'' کھڑا کرنا امریکی ضرورت ہے، وہ اس ''ہوے'' کے ذریعے دوسرے خطوں میں مداخلت کا جواز پیدا کرتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارا خطہ بھی اس قسم کی امریکی حکمت عملی کا میدان بنا رہا ہے، ہمارے خطے کی وہ تنظیمیں اور سیاسی گروہ جو پہلی سرد جنگ میں امریکی اتحادی رہی تھیں، مسلح تنظیموں سے تعلقات اور ان کی وکالت کے حوالے سے بہت سرگرم پائی گئی ہیں۔ اس کے برعکس خطے کی قدیم روائتی دینی تحریکات اور سیاسی جماعتوں نے اعتدال پسند رویہ اپنائے رکھا اور ہر ممکنہ طور پر کوشش کی کہ جذباتی اور متحرک دینی ذہن (بقیہ ص پر)

دینی جدوجہد اور تعلق مع اللہ

محمد ادریس اپل

دینی جدوجہد کا ایک اپنا مقام اور انداز ہے جو عام دنیا دارانہ جدوجہد سے قطعاً مختلف ہے۔ دنیاوی جدوجہد کا ہر پہلو عارضی ہوتا ہے اور دینی جدوجہد ہر لحاظ سے اخروی اور ابدی نظریہ لئے ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنے شب وروز کو محض دنیا کی عارضی زندگی تک محدود کر لیتے ہیں اور ان کا ہر قدم دنیاوی ترقی کے لئے اٹھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جدوجہد کا ثمرہ اسے ضرور عطا کرتا ہے، لیکن آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ جبکہ دینی جدوجہد عارضی تو ہوتی ہے لیکن اس کے ثمرات عارضی نہیں ہوتے بلکہ اس دنیاوی زندگی میں بھی اس کا بدلہ ملتا ہے اور آخرت میں تو اس کا بڑا ثواب ہے۔ لہٰذا دینی جدوجہد میں ابدیت وہمیشگی کا پہلو پوشیدہ ہے۔

جدوجہد اگر دینی انداز سے کی جائے لیکن اس کا اخروی پہلو مدنظر نہ ہو تو اس کو دینی جدوجہد کا نام نہیں دے سکتے۔ اسلامی انقلاب کی جدوجہد یا نفاذ شریعت کی تگ ودو کو اگر دنیاوی مسائل کا حل تصور کر لیا جائے کہ نفاذ شریعت سے انسان کی زندگی بن جائے گی، روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہوگا اور اس کے اخروی پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے، اس کو اللہ کا حکم اور انسان کی ذمہ داری سمجھ کر نہ کیا جائے اور دنیاوی بہتری کی امید پر یہ جدوجہد کی جائے تو بھی اس جدوجہد کو دنیاوی جدوجہد ہی کہا جائے گا، لہٰذا دینی جدوجہد صرف وہی شمار ہوگی جس میں ایک فرد یہ تصور کر لے کہ مجھے اپنے رب کی رضا چاہئے اور اس کی رضا کا ایک ذریعہ نفاذ اسلام کیلئے اپنی توانائیاں صرف کرنا ہے، یوں اپنے اللہ سے تعلق پیدا کئے ہوئے اسکی مخلوق کی بھلائی کا نظام نافذ کرنا یا اسکے نفا کوشش کرنا ہی دینی جدوجہد ہے۔

اس بنیادی نظریاتی فرق کے ساتھ ہی دینی اور دنیاوی جدوجہد کرنے والوں کے درمیان عملاً ایک فرق شروع ہو جاتا ہے جو مستقل اور متوازی طور پر چلتا رہتا ہے۔ دنیاوی جدوجہد سے متعلق شخص اپنے مال کے نقصان پر رنجیدہ ہوتا ہے اور اس کے حکم کے مطابق خرچ کرنے پر دلگرفتہ ہو جاتا ہے جبکہ دینی جدوجہد میں مال لٹانے والا فرحاں وشاداں ہوتا ہے، اسی طرح دنیا دار شخص کو جان کی قربانی پر حسرت ویاس گھیر لیتی ہے لیکن اللہ کے راستے میں جان کی قربانی دینے والا کھلے دل سے خندہ رو ہو کر قربانی پیش کرتا ہے۔ ایک طرف دنیا دار کو بھوک لگے تو اس کی بے تابیاں دیکھنے کی چیز ہوتی ہیں تو دوسری طرف اللہ کے حکم کے مطابق روزہ رکھ کر بھوک کو برداشت کرنے والا ایک عجیب روحانی لذت محسوس کرتا ہے۔ نماز، ذکر وفکر کو دنیا دار وقت کا ضیاع سمجھتا ہے اور دینی جدوجہد کے راستے کا راہی انہیں اپنی منزل کا نشان خیال کرتا ہے۔ آخرت اور موت کے ذکر سے دنیا دار کی جان نکلی جاتی ہے جب کہ دین والا اس کے ذکر سے اور موت کی یاد میں کھو کر اپنے رب کے سامنے ہوتا ہے ایک موت سے ڈرنے والا ہے اور دوسرا موت سے محبت کرنے والا۔ اس طرح ان کی زندگی میں ایک واضح فرق نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ دنیا دار حرام مال کو آسانی سے نگل جاتا ہے اور حلال اسے برا لگتا ہے جب کہ دیندار کیلئے حرام ایک زہر ہے جو اسے روحانی موت سے دوچار کر دیتا ہے۔

اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو مسلمان کی جدوجہد دینی جدوجہد کا آئینہ ہے اور کافر کی جدوجہد ہی دنیا دارانہ جدوجہد ہوتی ہے جس کی تہہ میں آخرت کا تصور نہیں ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری جدوجہد میں اب اخروی پہلو رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور دنیاوی پہلو تقویت پا رہا ہے اور یوں ہم اپنی دینی جدوجہد کی طرف سے دنیاوی جدوجہد کی جانب سفر کر رہے ہیں، یہ تو دینی جدوجہد کا نظریاتی اور فکری پہلو تھا۔

لیکن دینی جدوجہد ہم اسے ہی کہیں گے جو نہج نبوی پر ہوگی، جو جدوجہد نہج نبیؐ اور نہج صحابہؓ پر نہیں ہے اس کو ہم دینی جدوجہد کا تصور دینے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ صحابہ کرامؓ کی جدوجہد کا تصور دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ صحابہ کرامؓ کی جدوجہد کے دو انداز تھے وہ پہلے خود اسلامی طرز زندگی کا عملی نمونہ بن گئے اور پھر اس کی طرف خود دعوت دی کہ ہم اس طرز زندگی کی دعوت دیتے ہیں، تم بھی ایسا ہی طرز زندگی اختیار کر لو لہٰذا جس دعوت کو زبانی طریق سے ہزاروں سال میں پھیلنا تھا اور لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا تھا وہ دعوت چند برسوں میں دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئی اور ایک عالم اسلامی طرز زندگی کا گرویدہ ہو گیا۔ بجا ہے کہ دین کی دعوت فلسفہ وتحقیق سے بھی پھیلی ہے لیکن اس کے مواقع بہت کم آئے ہیں۔ حقیقتاً اگر دعوت دین کہیں پھیلی ہے تو اس کا واحد ذریعہ عملی زندگی تھی صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کے طرز زندگی کے گرویدہ ہو کر جہاں بھی گئے ہیں، انہوں نے اس خوشبو کو پھیلایا ہے۔ علمائے حق نے ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ معاشرے میں اسکے عملی نمونے پیش کئے تھے اور رسول اللہؐ کے اسوہ حسنہ کے امین بنے تھے تو ان کے اسوہ اور دعوت کی وجہ سے دین پھیل گیا۔ بزرگان دین جو مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں ہندوستان میں آئے، وہ کتابیں اور لائبریریاں ساتھ اٹھا کر نہ لائے تھے بلکہ وہ اسوہ پیغمبر ﷺ کی خوشبو اپنے جسموں پر سجا کر لائے تھے، تو دین ان کی بدولت پھیل گیا۔

صحابہ کرامؓ کی زندگی کا نقشہ جو عام طور پر کھینچا جاتا ہے کہ وہ رات کو اپنے رب کے حضور کھڑے ہوتے تھے، اس سے راز ونیاز کرتے، ان کی راتیں رکوع اور سجود میں گزر جاتیں لیکن صبح کے وقت وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہوتے، تلواریں ان کے ہاتھ میں ہوتیں اور میدان جنگ میں جوانمردی کے جوہر دکھاتے تھے، زبان پر اللہ کا ذکر ہوتا، نگاہیں دشمن کی چالوں کو سمجھ رہی ہوتیں، دماغ ان کی قوت پر حملہ آور ہونے کی تدبیر سوچتے، دست وبازو تلواریں چلاتے اور جب زخمی ہوتے تو اس پر فخر کرتے۔ شہادت قریب ہوتی تو اپنے رب سے ملنے کا شوق ہوتا اور اپنی کامیابی پر مسکرا رہے ہوتے تھے، لہٰذا ان کے دلوں میں ایمان کا جوش ہوتا اور ایمان ویقین کی ایسی کیفیت انہیں نصیب ہو جاتی تھی کہ پوری دنیا کی نعمتیں اسکے سامنے ہیچ تھیں یہ ان کی جدوجہد تھی، جو تعلق مع اللہ کا پہلو لیے ہوئے تھی۔

دینی جدوجہد کرنے والے کارکنوں اور جماعتوں کے لئے سب سے پہلے اخلاص کی ضرورت ہے اور پھر دین پر اپنے آپ کو بطور عملی نمونہ بنا کر اس کے بعد تعلق مع اللہ پیدا کرنے سے ہی کوئی دینی جدوجہد بار آور ہو سکتی ہے۔ ان تین چیزوں کے بغیر دینی جدوجہد بیکار رہے گی۔ اخلاص نہ ہو تو آدمی بک جاتا ہے چند ٹکوں کے عوض بکے یا ڈھیروں مال کے عوض، بہر حال بک جاتا ہے لیکن وہ لوگ کبھی نہیں بکتے جن کے ہاں اس دنیائے فانی کی حقیقت ایک بوسیدہ چیتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتی اور آخرت میں اللہ کی رضا کی قیمت دنیا جہاں نہیں بلکہ پوری کائنات نہیں بن سکتی۔ اکابر علماء حق کی جدوجہد اور کامیابیوں کی تاریخ سے کون واقف نہیں ہے؟ دارالعلوم دیوبند کی جب بنیاد رکھی گئی تو اس کی بنیاد میں اخلاص تھا، اتباع سنت اور تقوی کا جوہر نمایاں تھا اور تعلق مع اللہ تو وظیفہ زندگی تھا۔

تقویٰ اور اتباع سنت کے بغیر حقیقی عزت ومقام حاصل نہیں ہو سکتا اور زندگی ایک الجھاؤ بن جاتی ہے زندگی میں اخلاق اور کردار پیدا ہی نہیں ہوتا، بلکہ زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے۔ با مقصد زندگی کا اعزاز چھن جاتا ہے دشمنوں اور مخالفین پر رعب اور ہیبت جو تقویٰ کی وجہ سے ہوتی ہے وہ اٹھ جاتی ہے مشن اور پروگرام رک جاتا ہے اللہ کی مدد نہیں اترتی۔

تعلق مع اللہ سے آدمی پروگرام کیلئے ایثار اور قربانی پر آمادہ ہوتا ہے، اسے ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے اور دل کو سکون ملتا ہے، تعلق مع اللہ نہ ہو تو آدمی اس وقت تک چلتا ہے جب تک چھوٹی یا بڑی کامیابیاں سہارا بن رہی ہوتی ہیں اور جب کوئی ناکامی راہ لگے یا شکست کا سامنا ہو، تو پھر تعلق مع اللہ کے بغیر چلنے والے افراد اور جماعتیں مایوس ہو جایا کرتی ہیں اور مایوسی، بیکاری کا دوسرا نام ہے اور بیکاری غلامی کا پیش خیمہ ہے

اور غلامی ذلت ہے اور ذلت موت ہے اور مابعد الموت ایسے لوگوں کیلئے عذاب ہے۔ اکابر علماء حق کا عمل اسی پر رہا، انہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ وسائل نہ تھے، کوئی سہارا نہ تھا لیکن اللہ کی مدد ان کیساتھ تھی، بوریہ نشینوں نے شاہوں کے تاج وتخت اچھال دیئے۔ یہی شان صحابہ کرامؓ کی تھی، تابعین کا اسی پر عمل تھا، ائمہ ہدایت انہی اصولوں پر زندگی بسر کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کو کون نہیں جانتا کہ ایک متحرک زندگی گزاری۔ کئی سال قید فرنگ میں گزار دیئے کہ شب بیدار شخص تھے، سفر وحضر، آزادی اور قید میں تہجد ضرور پڑھا کرتے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ بہت بڑے انقلابی تھے، آپ انقلابی کیلئے تہجد کو لازمی قرار دیتے ہیں کہ یہ تعلق مع اللہ کا ذریعہ ہے۔

مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے بعد نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں درس انقلاب دیتے رہے۔ ریشمی رومال تحریک کے سلسلے میں گرفتار ہوئے، کابل کی جانب ہجرت بھی کی، پھر پاکستان میں ہر دینی تحریک میں پیش پیش رہے قائدانہ کردار ادا کیا۔ اس مجاہدانہ شان کے ساتھ ان کے روزانہ کے معمولات پر نظر کیجئے، استغفار ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ، سبحان اللہ وبحمدہ ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ، سبحان اللہ العظیم ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ، لا الہ الا اللہ ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ، رب اغفرلی بفضلک ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ، یا ستار یا غفار ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ، یارحمن یارحیم ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ۔ اس قدر عبادت اور ریاضت کے باوجود کبھی درس قرآن حکیم کا کبھی ناغہ نہیں کیا۔

اخلاص کا عالم دیکھئے کہ نواب حیات قریشی کے ہاں سرگودھا تشریف لے گئے۔ بھنے ہوئے چنے ہمراہ لے لئے اور انہیں پر گزارا کرتے رہے۔ نواب کے اصرار کے باوجود کھانا نہ کھایا۔ فرماتے تھے: دنیا کے غرور کی گردن کاٹنے کیلئے میں نے استغفار سے تیز آلہ نہیں دیکھا۔ اگر میں دنیاداروں کے تحائف لے لوں اور ان کے دسترخوان سے اعلیٰ اقسام کے کھانے کھاؤں تو شیطان ان کو یہ سکھاتا ہے کہ حضرت خاطر مدارت کروا گئے، کرایہ کے لئے پیسے لے گئے اور وعظ بھی سنا گئے۔ تو نے معاوضہ پورا دیا ہے۔ اس طرح میرے سارے اوقات رائیگاں جاتے۔ نہ ان کی آخرت سنورتی اور نہ مجھے اللہ کے ہاں سے اجر ملتا۔ اپنی سفر، تھکن، بھوک وپیاس کی شدت اور لذتوں کی قربانی صرف اس مقصد کیلئے ہے کہ مجھے اللہ کے ہاں سے اجر مل جائے اور میری محنت رائیگاں نہ جائے اور میرے وعظ سے ایک بندہ ہدایت پر آجائے۔

تقویٰ کا یہ عالم ہے کہ حج کیلئے تشریف لے گئے تو بحری جہاز میں بے نماز ملازمین کا پکا ہوا کھانا نہ کھایا۔ آٹھ دن پکی ہوئی چیز نہ کھائی، کبھی مشتبہ چیز جس میں حرام کا شائبہ ہو، نہ کھاتے تھے۔ اس کے باوجود قرآن حکیم کی تفسیر لکھی، مختلف رسائل لکھے، بطور مرکزی امیر جمعیۃ علماء اسلام کے اجلاسوں کی صدارت کرتے تھے، سیاسی ہنگاموں میں بھرپور کردارا ادا کیا۔ اگر کسی کے دل میں خیال گزرے کہ وہ تو صوفیاء میں سے تھے اور ہم سیاست میں کردار ادا کر رہے ہیں۔ تو وہ شخص بے شک ان کی سیاسی خدمات کو اور اپنی خدمات کو تول لے۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ کی سیاسی میدان میں خدمات اور قربانیاں بلاشبہ بہت زیادہ ہوں گی۔

یہ صرف مولانا احمد علی لاہوریؒ کی بات نہیں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ بقول شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کہ حضرت مدنیؒ نے سارا وقت درس وتدریس، افادہ باطنی، سیاسی مناظر اور قید وبند میں گزارا۔ جمعیۃ علماء ہند کے صدر تھے اور معمولات کا یہ عالم تھا کہ حجاز سے سفر کریں، کراچی اتر کر سیدھے دو دن اور دو راتیں ریل کے سفر کے بعد پانچ بجے دیوبند پہنچے تو چھ بجے بخاری شریف کا درس دیا۔ پندرہ پندرہ دن مسلسل دورے کرتے، سو سو میل سفر کر جاتے اور کئی کئی تقاریر کرتے، لیکن تھکن نہ ہوتی۔ ایک بار سہارنپور میں سیرت پر ایک ہفتہ وار تقریر کا وعدہ فرمالیا تو کئی مہینے عشاء کے بعد ایک بجے تک تقریر کرتے اور تین بجے رات ریل کے وقت کے مطابق بلا کسی کے جگائے سوار ہوتے، دیوبند پہنچ کر معمول کا سبق پڑھاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں تدریس کے دوران کئی زبانوں میں مسلسل درس دیتے اور صرف دن میں دو تین گھنٹے سوتے تھے۔ باطنی طور پر ان جیسا مقام اس وقت کسی کو نہ ملا۔ اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ وہ مدرس تھے اور صوفی تھے تو ان کی خدمات تدریس کو میزان پر لے آئے اور ان کی سیاسی خدمات کو بھی سامنے رکھ لے، ان کی باطنی محنت کو بھی دیکھ لے۔

مولانا مفتی محمودؒ کی سیاسی جدوجہد کے عروج کا زمانہ تحریک نظام مصطفیٰؐ کا زمانہ تھا۔ ہر روز اجلاس، ہر روز جلسہ وجلوس۔ لیکن ان حالات میں بھی نمازوں کی پابندی تھی اور جلسہ میں صدارت کے دوران نماز کا وقت ہوتا تو سٹیج پر ہی نیت باندھ لیتے تھے اور اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوجاتے۔ دوران اجلاس نماز کیلئے اٹھ جاتے اسلئے کہ بندہ خدا اپنی جدوجہد کو خدا کیلئے کر رہا تھا اور اس کے حکم کی نافرمانی یا تاخیر کا تصور ہی نہیں کرسکتا تھا۔ اور پھر یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت ہے کہ نوافل کے ذریعے آدمی کتنا ہی بلندی تک پہنچ جائے لیکن فرائض میں کوتاہی سے وہ اپنے مقام پر نہیں رہتا۔ اسمبلی کے اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے اور جب فارغ ہوتے تو جامعہ قاسم العلوم میں آکر درس حدیث دیتے ان سارے اشغال کے ساتھ ساتھ ترمذی شریف کی شرح بھی لکھ رہے تھے۔ ان کی سیاسی جدوجہد نہ عبادات میں رکاوٹ بنتی تھی، نہ درس وتدریس کے مشاغل چھوٹتے، نہ فتویٰ اور تحریر سے پہلوتہی ہوتی ان کی زندگی دینی جدوجہد کا نمونہ تھی۔

یہی عالم مولانا غلام غوث ہزارویؒ کا تھا۔ ایک بہترین مقرر، مخالفین پر جارحانہ وار کرنے والے یہ زبردست عالم دین شب بیدار تھے اور فقرِ بوذری سے انہیں نسبت خاص رہی۔ کوچہ سیاست کے اس نامور مجاہد نے حکمرانوں کا قرب بھی دیکھا اور ان کا عتاب بھی، لیکن طرز زندگی بدلا اور نہ کچھ کمایا، نہ جائیداد بنائی اور نہ وراثت چھوڑی، ان کا اجر تو اللہ کے ہاں ہے

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ بے مثال مدرس تھے ابوداؤد شریف کی شرح لکھی۔ شیخ الہندؒ نے جس زمانہ ہجرت حجاز کی، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ بھی وہاں موجود تھے۔ باوجود پیرانہ سالی کے رمضان المبارک میں مغرب کی نماز کے بعد نوافل کیلئے کھڑے ہوتے اور سوا پارہ پڑھتے یا سنتے، پھر آدھ گھنٹہ کھانے وغیرہ کیلئے وقفہ کرتے اور پھر تراویح کے لئے کھڑے ہوتے۔ ان کے ہاں تراویح پر سوا دو گھنٹے صرف ہوتے اور مدینہ منورہ میں تو شیخ تین گھنٹے عشاء اور تراویح پر خرچ کرکے دو گھنٹے آرام کرتے، پھر تہجد کیلئے اٹھ جاتے۔ سحری کے بعد صبح کی نماز اور نماز کے بعد اوراد ووظائف، اشراق کے نوافل کے بعد صرف ایک گھنٹہ آرام کرتے۔ پھر مطالعہ اور بارہ بجے سے ایک بجے تک بذل المجہود شرح ابوداؤد لکھتے اور ڈاک وغیرہ دیکھتے، خطوط کے جوابات لکھتے۔

شیخ الہندؒ سے بڑا سیاسی مجاہد کون ہوگا؟ تراویح کے بعد صبح کی نماز تک نوافل پڑھتے رہتے اور کئی کئی حفاظ سے قرآن مجید سنتے تھے۔ رائے پور کی خانقاہ کے مجاہدانہ کردار سے انکار نہیں حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ دن رات تلاوت کا معمول بناتے، ملاقاتیں بند کردیتے تھے، یہاں تک کہ ڈاک بھی نہ دیکھتے، تراویح کے بعد جتنی دیر میں دو کپ چائے پی جاتی ہے اتنی دیر صرف فراغت ہوتی، اتنی دیر میں بات چیت ہوسکتی تھی۔

قائد تحریک نظام مصطفی حضرت مولانا مفتی محمودؒ رمضان المبارک اپنے آبائی گاؤں میں گزارتے تھے، سب سرگرمیاں معطل کردیتے اور آخری عشرے کا اعتکاف کرتے تھے یا عمرہ پر تشریف لے جاتے۔ غرض اکابر علماء حق کی زندگی میں رمضان المبارک ایک نعمت کی حیثیت رکھتا تھا وہ خواہ شعبہ تدریس سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاسی جدوجہد ان کا میدان ہوتا وہ اپنی جدوجہد کے اصولوں سے انحراف نہ کرتے تھے۔ سیاسی کام کرتے ہوئے دینی جدوجہد کا تشخص ختم ہو جانا انتہائی کم نصیبی ہے۔ یہ ان حضراتِ اکابر کی اخلاص پر مبنی جدوجہد تھی جس کے ثمرات یہاں تک پھیلے کہ دین کی صحیح تعبیر وتشریح ایک عرصہ تک محفوظ رہی اور ان کے نقوش قدم محفوظ ہوگئے جو آج ہر راہئ سیاست کیلئے دعوت عمل ہیں۔ کارکنان جمعیۃ علماء اسلام کو چاہیے کہ وہ اخلاص، تقویٰ اور تعلق مع اللہ کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں شریک ہوں لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہیں ہے اور ہمارے نعرے لگانا، اجلاس کرنا، جھنڈے اٹھانا، جلسے کرنا، جلوس نکالنا، جیلوں میں جانا تکالیف اور طعنے برداشت کرنا حکمرانوں کے عتاب کا نشانہ بننا اللہ کی رضا کیلئے نہیں اور اس سے مقصد اپنی آخرت کی بہتری نہیں تو یقین کر لیجئے کہ یہ سب کچھ جو دین ہی کا کام نظر آرہا ہے محض اپنے وقت کا ضیاع ہے۔ اور اس طرح اگر ہم اپنی زندگیوں کی تعمیر اسوہ حسنہ کے مطابق نہیں کر رہے ہیں اور دینی شعائر اور سنت رسولؐ کی ہمارے ہاں کوئی قدر قیمت نہیں تو یہ اسلامی انقلاب کے نعرے جرم ہیں اور اگر ہم اپنی جدوجہد میں تعلق مع اللہ کو اہمیت نہیں دیتے اور باطنی اصلاح کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں کرتے تو غلبہ اسلام کے یہ نعرے اور خواب محض خواب ہیں۔

(بشکریہ ماہنامہ ''الجمعیۃ'' راولپنڈی)

حرفِ حسین

رائے محمد حسین کھرل

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے پیروکار

اور پاکستان سے محبت

پاکستان کے معرضِ وجود میں آتے ہی جمعیت علماء کی دوطرفہ قیادت (پاک وہند) نے نا صرف پاکستان کو تسلیم کیا، بلکہ اس کے تقدس، حفاظت، اور سالمیت کو مسجد کی مانند قرار دیا۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ حمایت وعدم حمایت کی یہ بحث ختم ہوجاتی، لیکن نجانے کیوں دائیں بازو کے بزعمِ خود دانشور آئے دن جمعیت علمائے اسلام اور پاکستان میں مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کی فکر سے وابستہ لوگوں کو کٹہرے میں کھڑا کر کے ان سے حُب الوطنی کا سرٹیفکیٹ طلب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ ان ''دانشوروں'' کو بخوبی معلوم ہے کہ مولانا سید حسین احمد اوران کے وابستگانِ فکر کے نزدیک تو''قومیت'' کی بنیاد بھی وطنیت پر ہے۔ پھر بھلا ایسی فکر کے حاملین کی حُب الوطنی کیونکر مشکوک ہوسکتی ہے؟ ہاں البتہ حضرت مدنی کی فکر کا حامل کوئی بھی پیدائشی پاکستانی آپ سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ پہلے آپ اپنی پوزیشن واضح کریں کہ حُب الوطنی میں آپ کہاں کھڑے ہیں؟ کیونکہ کوئی بھی فضل اللہ یا بغدادی آپ کو مذہب کے نام پر گمراہ کرسکتا ہے کہ آپ کے نزدیک قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے ''اُمۃ'' کا بھی ایک مخصوص تصور، جس کے باعث ملکوں کی سرحدات آپ کے ہاں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معاہدہ حدیبیہ کے بعد مکہ سے آنے والے مسلمانوں کو واپس اور بنوخزاعہ کے مشرکین کا انتقام لینے کیلئے مکہ والوں کے خلاف لشکر کشی فرما کر نا صرف معاہدات کے نتیجے میں ہونے والی حد بندیوں کا احترام سکھلاتے ہیں، بلکہ ایک طرح وطنیت کی بنیاد پر وجود میں آنے والی قومیت کی صحت پر بھی مہر تصدیق ثبت فرماتے ہیں کہ مدینہ کی ریاست کا مکہ والوں سے معاہدہ تھا، جس میں بنوخزاعہ باوجود مشرک ہونے کے ریاستِ مدینہ کے حلیف تھے، مگر مکی مسلمانوں کو باوجود مسلمان ہونے کے ازروئے معاہدہ واپس مکہ لوٹایا جانا طے تھا۔ اسی لئے معاہدہ حدیبیہ کے بعد مکی مسلمان مکہ والوں کے چنگل سے نکل کر ساحل سمندر پر جمع ہوئے اور وہاں اپنی الگ عملداری قائم کی۔ جہاں انہوں نے نہ تو خود معاہدہ حدیبیہ کی پابندی لازم سمجھی، نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کی پابندی کرنے کو فرمایا اور نہ ہی اہل مکہ نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے یہ مطالبہ کیا، کہ ساحل والوں کو واپس مکہ بھیجیے۔ آخر کیوں؟ صرف اس لئے کہ یہ تیسرا فریق مکہ و مدینہ کے باہمی معاہدات کا پابند نہ تھا۔ جیسا کہ درج ذیل واقعہ بھی اہل مکہ کی طرف سے ان کی الگ عملداری کو تسلیم کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ سہیل بن عمرو نے حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہونے والے قبیلہ سہیل کے شخص کی دیت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقاضا کرنا چاہا تو ابوسفیان نے کہا کہ چونکہ ابو بصیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدینہ سے واپس کر دیا تھا، اس لئے ان پر دیت نہیں بنتی بٹھہریے اپنا''فتویٰ'' سنبھال رکھیے کہ مفتی کفایت اللہ دہلوی جیسے مفتی اعظم ہند اور دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث پر بیٹھ کر درس حدیث دینے والا حسین احمد مدنی جیسے شیخ العرب والعجم کہا گیا، کا وطنیت کو بنائے قومیت قرار دینا اگر گمراہی ہے تو ایسے لوگوں کا فہم دین کیا ہوا؟ کیا وطنیت کو قومیت کی بنیاد جاننے کی پاداش میں ایسے لوگ بھی آپ کے ہاں گمراہ قرار پائیں گے جن کے شب و روز قرآن وحدیث کے درس وتدریس میں ہی گزرے؟ خداوندِ عالم کی آخری کتاب کہتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے وہ منتخب بندے (انبیاء کرام علیہم السلام) جن کو رب العالمین نے انسانیت کو پیغامِ ہدایت پہنچانے کی ذمہ داری بخشی، وہ جب قوم کو مخاطب کرتے ''اے میری قوم'' کہہ کر کرتے۔ حالانکہ وہ لوگ اس وقت تک ایمان بھی نہ لائے ہوتے۔ اس پر کیا کہیئے گا اے میری قوم کے''روشن فکر'' دانشورو! کہ خدا کے ان برگزیدہ بندوں (انبیاء کرام علیہم السلام) کے ساتھ کفار''علاقہ و قومیت'' کیا ہوا، ماسوائے وطنیت کے؟

میں یوں ہی دست وگریباں نہیں زمانے سے
میں جس جگہ پہ کھڑا ہوں کسی دلیل سے ہوں

سیاسیات

محمد عرفان شجاع

آئین سے واقفیت

سیاسی کارکن کی ضرورت

آئین ان بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہے جن کی رہنمائی میں کسی ریاست میں قوانین اور اُن سے مختلف اصول وضوابط کی تشکیل ہوتی ہے، ریاست اور فرد کے باہمی حقوق وفرائض کی بھی تعیین ہوتی ہے پھر اُن کی روشنی میں ریاست کے معاملات انجام دیے جاتے ہیں۔ تمدنی ترقی کے ساتھ جب انسان قبائلی زندگی سے شہری زندگی میں داخل ہوا اور ریاستیں وجود میں آئیں تو ریاست میں موجود اقوام اور مختلف گروہوں کے درمیان مختلف قسم کے عُمرانی معاہدے تشکیل پائے۔

یہ آئین کی ابتدائی شکلیں تھیں، سُمیری، حمورَبی اور یونانی تہذیبوں اِس کی مثالیں ملتی ہیں۔ میثاق مدینہ بھی اسی نوعیت ہی کی دستاویز تھی، جو مدینہ میں رہنے والے دو گروہوں مسلمان اور یہود کے درمیان عُمرانی معاہدہ تھا اور جس کے معاہد خود حضور ﷺ کی ذات والا صفات تھی۔

آئینی تاریخ کا ایک اور عُمرانی معاہدہ میگنا کارٹا (Megna Carta) کے نام سے مشہور ہے جو انگلینڈ میں، بادشاہ اور باغیوں کے درمیان ہوا، جس کے بعد یورپ میں چرچ اور بادشاہت کے استبداد کے خلاف تحریک کا آغاز ہوا۔

جیسے جیسے تمدنی شعور نے ترقی کی آئین کی اہمیت وافادیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آج کی جدید دُنیا میں آئین اِنسانی حقوق کی پاسداری اور عمل داری کا ضامن ہے۔ جو ریاستوں میں امن قائم رکھنے میں بنیادی ضرورت ہے۔

بنیادی طور پر آئین میں دو طرح کے معاملات ہوتے ہیں ایک انتظامی؛ مثلاً ریاست کے کتنے اِنتظامی یونٹ ہوں گے، کون سے معاملات اُن کے دائرہ اختیار میں ہوں گے، پارلیمان کا طریقہ اِنتخاب، قانون سازی کا طریقہ اور عہدوں کی تقرریاں وغیرہ، دُوسرے نظری امور ہیں؛ جیسے پالیسیاں بنانا جن کی پیروی میں ریاست کی قانونی وسماجی سمت طے کرنا، ترجیحات اور مقاصد کی تعیین اور ہیئت حاکمہ کے فرائض وغیرہ۔

پاکستان سمیت دُنیا کے ہر ملک میں سیاسی جماعتیں اپنے پروگرام، نظریے اور محنت کی بنیاد پر، عوام کی تائید سے ووٹ لے کر حکومتوں کا نظم ونسق سنبھالتی ہے اور اپنے پروگرام کو عملی صورت میں پیش کرتی ہیں۔ چونکہ سیاست نام ہے الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے کا، اِس لیے، سیاسی جماعتیں، جہاں حکومت واقتدار کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی ہیں وہیں اُن کی ذمہ داری ہے کہ عوام میں سیاسی شعور کی بیداری کے لیے بھی محنت کریں کیونکہ قومیں جب سیاسی شعور سے عاری ہوجاتی ہیں تو ان پر نااہل لوگ مسلط ہوجاتے ہیں۔ چونکہ تمام جماعتوں کی سیاسی محنت آئین کے دائرے میں ہے، اسی لیے آئین کی تفہیم اور سے کما حقہ واقفیت سیاسی کارکنان کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہاں آئین کو سمجھنے اور اُس کی تفہیم کے لیے اگلے صفحے پر اُس خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے یہ سلسلہ ''صفحات'' میں جاری رہے گا۔

آئین پاکستان کا ڈھانچہ

☆ منظوری ۱۰/اپریل 1973ء

☆ نفاذ ۱۴/اگست 1973ء

1۔ باب 12

2۔ آرٹیکلز 280

3۔ شیڈول 5 (اٹھارویں ترمیم کے بعد شیڈول ششم اور ہفتم حذف کیے گئے)

4۔ ضمیمہ جات 1 عدد (قراردادِ مقاصد)

ضمیمہ 1 (قراردادِ مقاصد)

[redacted] ☆ آرٹیکل 1 تا 7

1۔ ریاست کے خدوخال

2۔ جغرافیہ

3۔ ریاست کا مزاج، سمت

(7 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 8 تا 28

شہریوں کے بنیادی حقوق

(21 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 29 تا 40

پالیسی کے رہنما اصول

(11 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 41 تا 49

صدر پاکستان، انتخاب، اختیار، برخواستگی

(8 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 50 تا 89

پارلیمنٹ

(39 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 90 تا 100

وفاقی حکومت

(11 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 101 تا 140

صوبائی حکومتیں -1 گورنر 101 تا 105

-2 صوبائی اسمبلی 106 تا 117

-3 آرڈیننس/مالیاتی امور 118 تا 128 A

(40 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 140A

مقامی حکومتیں

[redacted] ☆ آرٹیکل 141 تا 159

صوبہ۔ وفاق تعلقات

-1 قانون سازی 141 تا 144

-2 انتظامی امور 145-155

-3 خصوصی امور 152-A-159

مشترکہ مفادات کونسل

قومی اقتصادی کونسل

(19 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 160 تا 174

مالیاتی اُمور

قومی مالیاتی کمیشن

(15 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 175 تا 212

عدلیہ

سپریم کورٹ/ ہائی کورٹ/ شرعی عدالت

(38 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 213 تا 226

الیکشن کمیشن

[redacted] ☆ آرٹیکل 227 تا 231

اِسلامی دفعات

(5 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 232 تا 237

ایمرجنسی کا نفاذ

(6 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 239 تا 238

آئین میں ترمیم کا طریقہ کار

[redacted] ☆ آرٹیکل 240 تا 245

مسلح افواج

(6 آرٹیکل)

[redacted] ☆ آرٹیکل 246-247

فاٹا (FATA)

[redacted] ☆ آرٹیکل 248 تا 280

زبان، حق ملکیت وغیرہ

نقطہ نظر

سیاسی مکالمے کی کمزوریاں کیسے دور کی جائیں

تموجن مرزا

ہمارے ہاں سیاسی منظر نامہ کی تصویر کشی ہمیشہ مخاصمت اور محاذ آرائی کی کیفیت ہی سے کی جاسکتی ہے اور حیرانی کی بات ہے کہ ہم لوگ اس سب کو سیاسی جدوجہد کا نام دینے والوں کا ہمیشہ سے ساتھ دیتے آئے ہیں اور دیتے رہنے کے ہی آثار نظر آتے ہیں۔ جمہوری عمل جس ارتقا کا نام ہے وہ ناپید رہنے کی بنیادی وجہ یہی انداز سیاست ہے جو ہمارے خطہ میں رہنے والے جبلی طور پر پسند بھی کرتے ہیں۔ جلاو، گھیراو اور شور مچاو سیاست کے بڑے ہتھیار سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ ایک خیال کے مطابق نوجوان نسل کے نزدیک زندگی کے تمام پہلووں میں یہ خصائص اعلیٰ اور جرات مندی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ صحافیوں سے لے کر جرنلوں تک نام نہاد شعلہ بیانی (حالانکہ شعلہ بیانی اور لچر پن میں فرق ہوتا ہے) (کی خصوصیت سے بھرپور لوگ ہی محب وطن سمجھے جاتے ہیں جبکہ دھیمے لہجے میں بات کرنے والے، حقائق پیش کر کے مدلل جواز پیش کرنے والے اور جنگ سے گریز کرنے کی اہمیت پر زور دینے والے بزدل اور اکثر غدار قرار دیے جاتے ہیں۔ دس گھنٹے بجلی نہ آنے، ٹارگٹ کلنگ اور پانی کی کمیابی پر شور مچانے والے اسی جوش و خروش بلکہ اس سے بھی زیادہ شد و مد سے جنگ پر تیار ہوتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ جناب جنگ میں تو بجلی آتی ہی نہیں اور پانی کا حصول جوئے شیر لانے سے ذرا زیادہ ہی مشکل ہو سکتا ہے جبکہ کلنگ میں سے ٹارگٹ کا سابقہ ہٹا کر بے دریغ اور مسلسل کا سابقہ لگ جاتا ہے۔ لیکن کیا کہئے کہ باتوں باتوں میں ہم نیل کے ساحل سے تابخاک کاشغر سب فتح کر لیتے ہیں اور اس میں برا بھی کیا ہے، قوم بھی کچھ دیر کو اس رومان میں کھو جاتی ہے اور جرات و ہمت کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے اس سے قطع نظر کہ جب امریکہ (امریکہ اس لئے کہ عام طور پر جو کرتا ہے امریکہ ہی کرتا ہے) کا دل کرتا ہے وہ کھل کھیلتا ہے اور آپ تب باتیں بھی نہیں کر پاتے۔ طرہ یہ کہ پھر کتابیں لکھ کر بانگ دہل آپ کے تمام بیانات اور دعووں کی نفی کرتے ہوئے سب کہ ڈالتے ہیں اور کوئی تردید کرنے کی جرات بھی نہیں کر پاتا۔ خیر جرات و ہمت کے دعووں سے قطع نظر، بات تھی ہمارے سیاسی رویوں کی۔ گو پچھلے کچھ برسوں سے سیاسی عمل میں بہتری آئی ہے اور سیاسی قوتیں بھی کسی حد تک بالغ نظری کا مظاہرہ کرنے پر مجبوراً تیار ہو رہی ہیں، جمہوریت بہر حال تنے ہوئے تار پر بازیگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیسے تیسے چلتی جا رہی ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ سیاسی قوتوں اور عوام کے لئے اب تک سب سے بڑے مسائل انتخابی عمل میں ہو چکی بے قاعدگیاں اور ایک فریق کے لئے کرسی ہلانا اور دوسرے کے لئے بچانا ہی ہیں۔ ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی چٹ پٹی خبر جو انہی مسائل سے متعلق ہوتی ہے زینت زبان و بیان بنی نظر آتی ہے، لفاظی اور علم و فضل کے دریا بہائے جاتے ہیں، عوام سوشل میڈیا اور اصل زندگیوں میں ایسی ہی باتوں پر دست و گریبان نظر آتے ہیں جبکہ سیاسی معاملات میں مہارت تو اب صرف ماوس ہلانے ہی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ رہے عوامی مسائل تو بھیا وہ تو ہمیشہ سے ہیں، اصل بات تو یہ ہے کہ ملک میں حکومت کس کی ہونی چاہیے۔ کسی بھی جگہ سیلاب یا کسی اور مشکل کو صرف سیاسی مقاصد کے لئے ہی استعمال کیا جاتا ہے اور جدید ذرائع ابلاغ نے تو اس عمل کو مزید نکھار عطا کیا ہے کہ بھوک سے بگڑی ہوئی شکلوں، پانی سے بھرے ہوئے گلی کوچوں، تباہ حال غریبوں اور ٹوٹے ہوئے بندوں کی تصاویر ان گنت بار دکھا دکھا کر شاید بے حسی ہی کو فروغ دیا جاتا ہے کہ ہر سال یہی سب دیکھنے کے باوجود ان جذباتی لمحات کو چھوڑ کر بنیادی سوال اقتدار میں بیٹھے ہوئے اشخاص اور ان کے ہونے یا نہ ہونے سے متعلق ہی رہتا ہے۔ ہم کھانا کھاتے ہوئے بے گھر، بے در اور بھوکوں کو دیکھ کر چچ چچ کرتے ہوئے بھوک کی سختیوں کا بلیغ اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کی بے لوث خدمت کرنے پر ملنے والے اجر کا ذکر کرتے ہوئے دوبارہ لقمے توڑنے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور صرف چند لمحات بعد اسی چینل پر چلنے والی کسی چٹ پٹی خبر پر ہمیں وہ اجر بھی بھول جاتا ہے اور وہ افسوس بھی جبکہ قہقہہ ایسا ہوتا ہے کہ حلق سے نیچے جاتا لقمہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس موقعہ پر ہمدردی میں کہے گئے فقروں کا چٹخارہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ ہم کھانا ختم کرنے کے بعد بھی انہیں یاد کر کر کے اپنی بلاغت کے لطف میں بار بار کھو جاتے ہیں اور اس یاد کرنے کے عمل میں ہمارے تقویٰ کو نفس اور شیطان مردود سے جو خطرہ لاحق ہوتا ہے اس پر بار بار توبہ بھی کرتے ہیں اور سب کے سامنے غیر اضطراری طور پر کانوں کو ہاتھ لگا کر ارد گرد والوں کو بھی اس معصومانہ عمل تقین میں شریک کر لیتے ہیں۔ جرات ایمانی، ایثار اور انسانیت دوستی کے اس بے مثال مظاہرہ کے بعد ہم اپنی ذہانت کا اطلاق بین الاقوامی مسائل، ان کے ہمارے ملک پر اثرات اور ترقی یافتہ ممالک کی قیادت کے دیسی قیادت سے موازنہ کے بعد اقتدار کی منتقلی کے تمام امکانات پر کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ خارجہ امور اور ان پر ہماری کمال گرفت بھی دوران گفتگو یا فیس بک پر دوران تحریر مدنظر رہتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سب سے عوام کو خود کیا حاصل؟ کیا اس تمام عمل اور سوالات صرف رموز حکمرانی تک ہی محدود رہنے سے کیا تمام بنیادی مسائل حل ہو سکتے ہیں یا یہ شترمرغ کی طرح ریت میں سر دیے رہنے اور سب خود ہی ٹھیک ہو جانے کی خواہش کا بالواسطہ اظہار ہے؟ جب تک عوام تمام بنیادی مسائل کو حقیقی نظر سے دیکھ کر حکمرانوں سے ان پر بات کرنے یا ان کی توجہ ان مسائل کی طرف مبذول کرانے کی طرف قدم نہیں بڑھائیں گے، یقین رکھیے اس سمت میں کوئی بہتری شاید ہی دیکھنے میں آئے گی اور آنے والی حکومتوں کی ترجیح بھی یا تو نظروں کو دکھنے والے اور کم از کم عرصہ میں معیار کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر بننے والے مہیب منصوبوں یا زبانی دعووں تک ہی محدود رہے گی۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ بنیادی ڈھانچہ یا انفراسٹرکچر بنانا واقعی اہم ہوتا ہے لیکن ان کی آڑ میں تعلیم، صحت اور فلاح عامہ کے دوسرے منصوبوں کو نظر انداز کر دینا بھی ترقی معکوس ہی کا سبب بنتا ہے۔ ترقی کے یہ سب عوامل پہلو بہ پہلو ہی ایک ترقی یافتہ، مہذب، تعلیم یافتہ اور کسی حد تک مطمئن معاشرہ اور ممالک کو جنم دیتے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنا پڑے گا کہ حکمرانوں کے مسائل ہمارے اصل مسائل نہیں بلکہ بیان کردہ دوسرے پہلو ہماری توجہ کے مکمل طور پر حامل ہونے چاہییں اور ہماری بحثیں، باتیں اور بیٹھکیں ان سب پر حقیقی اور عملی تبادلہ فکر پر مشتمل ہونی چاہییں۔ یاد رکھیے کہ مقتدر طبقہ یہ کبھی نہیں چاہتا کہ آپ کی توجہ ان مسائل کی طرف جائے کیونکہ اس سب سے ان کی جیب میں جانے والا حصہ، بلا سوال حکمرانی کا استحقاق اور بغیر کام کیے تمام تحسین کے حقدار ہونے کو کاری زک پہنچتی ہے۔ یہ بات بھی قابل غور اور انتہائی اہم ہے کہ یہ تمام عمل عام طور پر فروغ پذیر جگت بازی، اظہار خیال میں دشنام طرازی اور مدلل گفتگو سے بیزاری کے رجحانات سے پاک ہونا چاہیے۔ ایسا ہو سکتا ہے تو ٹھیک ورنہ وہی سب جاری رکھیے، کم از کم آپ کا مزہ تو کرکرا نہیں ہوگا۔ (بشکریہ: دنیا پاکستان)

بقیہ: یک محوریت کا خاتمہ

کے حاملین کو عسکریت پسندی سے باز رکھا جائے۔ عالمگیر تبدیلی کے ظاہر ہوتے ہوئے نئے رخ پر ہمیں ایک بار پھر بحیثیت قوم و ملک، انسان دوست طرز عمل اپنا کر دار تشکیل دینا چاہیے، ہمیں یہ فائدہ حاصل ہے کہ ہمارے پڑوس میں چائنا کی صورت میں ایک عالمگیر اقتصادی موجود ہے، اس کیساتھ ہمیشہ سے کہیں بڑھ کر اچھے تعلقات ہیں۔ چین کے ساتھ خنجراب تا گوادر راہداری منصوبہ اور اس میں ایران، افغانستان (اس کے ذریعے وسطی ایشائی ریاستوں) کی شراکت ہمیں موقع دے رہی ہے کہ ہم جنوبی ایشیاء کے افق پر اپنا نام روشن کریں۔ اس ہدف کی جانب بڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بدلتی ہوئی عالمی صورت حال کو اس کی جزئیات سمیت سمجھیں، ردعمل، اشتعال اور جذباتی کیفیتوں سے بچتے رہیں۔ حقیقت پسندی، بھائی چارہ، برداشت اور رواداری کو اپنا شعار بنائیں، ہماری ریاست اور حکومت کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ وہ ماضی کے تجربات کی روشنی میں انتہائی دھیمے انداز سے اپنا رخ موڑ رہی ہے اور اس حوالے سے عالمی دباؤ کا مقابلہ کر رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل پاکستان اپنی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کریں اور اپنے کردار میں پائے جانے والے جھول کو توازن میں لائیں، اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو آمین۔ (بشکریہ ماہنامہ "الجمعیۃ" راولپنڈی)